باب پنجم

اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

نظیر اکبر آبادی کی شاعری

میاں ولی محمد نظیر اکبر آبادی اپنے نجی و عمومی زندگی کے بے مثل و بے نظیر انسان تھے۔ وہ اردو شاعری کے روایتی دبستانوں سے وابستہ نہیں تھے اور نہ وہ کبھی کسی امیر کے درباری سے متوسل رہے۔ وہ اپنی ذات میں خود ایک دبستان تھے، جس کی کچھ اپنی خصوصیات ہیں۔ نظیر کی شخصیت اور اُن کی شاعری دونوں میں بڑا تنوع اور ہمہ رنگی ہے۔ وہ بقول شیفتہ علم اور خلق و انکسار میں بے نظیر روزگار تھے (۱)۔ وہ اعلیٰ و ادنیٰ، امیر و غریب، عالم و جاہل، قوی و ناتواں، عابد و عاصی، سبھی کے دوست تھے۔ ان کے دل میں ہر انسان کے لیے جگہ تھی۔ وہ زندگی کے ہر میلے میں ہنس ہنس کر شریک رہے، معاشرے کے ایک عام فرد کی حیثیت سے بھی اور ایک تماشائی اور مبصر کے روپ میں بھی۔ آگرے کے اس عوامیت پسند شاعر نے فنی اعتبار سے بھی اس عہد کی مقبول عام صنف سخن یعنی غزل کی بجائے نظم کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ ہر چند کہ نظیر نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن بقول اثر لکھنوی وہ اس میں کوئی امتیازی شان پیدا نہ کر سکے۔ البتہ سادگی اور صفائی نے کہیں کہیں جاذبیت اور طبیعت کی چلبلاہٹ نے تازگی و شگفتگی بہم پہنچا دی ہے۔ چونکہ طبیعت کا قدرتی میلان نظم کی طرف تھا، اس لیے بعض غزلیں مسلسل ہی نہیں بلکہ نظم نما ہیں (۲)۔ نظم کی جولان گاہ میں نظیر کے رہوار سخن نے اپنی جولانی طبع کے بے مثال جوہر دکھائے ہیں۔ اردو شاعری میں نظیر کا انفرادی مقام بھی دراصل ان نظموں ہی کی بدولت ہے، جن کے وسیع تر دامن میں انھوں نے زندگی کے تنوع اور رنگا رنگی کے پھول بھی اکٹھے کر دیے ہیں اور کانٹے بھی۔ "گلشن بے خار" کے مؤلف شیفتہ نے نظیر کے کلام کو سوقیانہ قرار دیا ہے اور اکثر دوسرے قدیم تذکرہ نگاروں نے غالباً اسی وجہ سے اُن کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے برعکس دور جدید کے بعض نقادوں نے نظیر کو طبقۂ عوام کا شاعر قرار دیتے ہوئے قدیم دور کے دوسرے اردو شعرا کو طبقۂ خواص (جاگیردار) کا قصیدہ خواں کہا ہے اور نظیر کی شاعری کو اس عہد کی حقیقی شاعری کے ریگستان میں ایک شاداب گلستان سے تشبیہ دی ہے (۳)۔ قدیم تذکرہ نگاروں نے اگر نظیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا تو جدید دور کے بعض نقادوں نے نظیر کے لیے وجہ امتیاز پیدا کرنے کے لیے قدیم شعراء کو عمومی جذبات و احساسات سے یکسر عاری قرار دے دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ نظیر کے سوا کسی ایسے شاعر کا نام مثال کے طور پر بھی نہیں ملتا جو عوام اور عوام کے مسائل سے قریب تر آئے (۴)۔ "سانگ تقلید" کا یہ رخ بھی انتہا پسندانہ ہے اور

عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا، کیونکہ دوسرے اُردو شعراء نے بھی مقدور بھر عمومی مسائل حیات کو اپنے فن میں جگہ دی ہے (جس کا جائزہ دوسرے ابواب میں لیا گیا ہے)۔ نظیر اکبر آبادی کے الگ مطالعے کی ایک اور وجہ نظیر کا عہد بھی ہے۔ نظیر نے سودا و میر سے لے کر ذوق و غالب تک کا زمانہ دیکھا۔ ان کی وفات ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء (۲۶ صفر ۱۲۴۶ھ) کو ہوئی۔ عمر خاصی طویل (سو برس کے لگ بھگ) پائی۔ بعض روایت کے مطابق محمد شاہ کے عہد میں نادری حملے کے قریب پیدا ہوئے (۵)۔ گویا نظیر کا عہد شمالی ہند میں اردو شاعری کے تینوں ادوار یعنی متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے بین بین چلا جاتا ہے۔

نظیر کا ماحول:

زمانے اور ماحول کے اعتبار سے نظیر نے سیاسی و معاشی دار و گیر کے عین شباب میں آنکھ کھولی۔ نادر اور ابدالی کے حملے، مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں اور سکھوں سے لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی تک کی غارت گریوں کے سانحات ان کے سامنے گزرے۔ نظیر کی سکونت زیادہ تر آگرہ میں رہی۔ ابھی اُن کا بچپن تھا کہ شاہ ابدالی کے حملوں کے دوران وہ اپنی ماں کے ساتھ دلی سے آگرہ چلے آئے اور عمر کا باقی طویل حصہ آگرہ میں ایک معلم کی حیثیت سے گزار دیا۔ آگرہ دلی کے بعد مغلوں کا دوسرا بڑا مرکزی شہر تھا۔ عروج کے زمانے میں بہت سے مغل شہنشاہوں نے اس کو اپنا دارالسلطنت بنایا تھا۔ اکبر اور شاہ جہاں تو سپردِ خاک بھی یہیں ہوئے۔ مغلوں کے عہدِ زریں کی یادگار ''تاج محل'' کا شمار آج بھی عجائب روزگار میں ہوتا ہے۔ اسی سے اس تاریخی شہر کی قدیم عظمت و حشمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اورنگ زیب اور اس کے جانشینوں کے عہد میں سیاسی انقلابات کا مرکز دلی بن گیا اور آگرے کی مرکزی اہمیت بہت کم ہو گئی۔ حتیٰ کہ دورِ زوال میں جاٹوں نے اس عظیم الشان شہر کو اپنی تاخت و تاراج کا ہدف بنا کر خوب لُوٹا کھسوٹا اور آگرہ کی حالت بھی دلی کی طرح روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ نظیر نے ایک مختصر سا قطعہ شہر آگرہ کے متعلق لکھا ہے جس سے اس شہر کی تاریخی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے اور سیاسی حوادث نے آگرہ کو تباہی کے جس کنارے تک پہنچا دیا تھا، اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے:

رکھتا ہے گو قدیم سے بنیاد آگرہ ۔ اکبر کے نام سے ہُوا آباد آگرہ
یاں کے کھنڈر نہ اور جگہ کی عمارتیں ۔ یارو! عجب مقام ہے دل شاد آگرہ
شداد زر لگا نہ بناتا بہشت کو ۔ گر جانتا کہ ہووے گا آباد آگرہ
توڑے کوئی قلعے کو کوئی لُوٹے شہر کو ۔ اب کس سے اپنی مانگے بھلا داد آگرہ
اب تو ذرا سا گاؤں بھی بیٹی نہ دے اسے ۔ لگتا تھا ورنہ چین کا داماد آگرہ
ایک بارگی تو آب مجھے یا رب تُو پھر بسا ۔ کرتا ہے اب خدا سے یہ فریاد آگرہ
ایک خوبرو نہیں ہے یہاں ورنہ ایک دن ۔ تھا رشکِ حسن بلخ و نوشاد آگرہ

Scanned with CamScanner

ہرگز وطن کی یاد نہ آوے اُسے کبھی جو کر کے اپنی جاں کو کرے شاد آگرہ

اس زمانے میں ملک بھر کو جن ابتر سیاسی حالات سے دوچار ہونا پڑا، آگرہ اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ بکسر کے بعد تباہی و بربادی اور کھنڈرات کے عبرت انگیز مناظر اگر کہیں دیکھے جا سکتے تھے، تو وہ یہی شہر تھا، جو کبھی مغلوں کے جاہ و جلال اور شوکت و حشمت کا مظہر تھا، لیکن اب جاٹ گردی اور مرہٹہ تگ و تاز نے اس کی عظیم الشان عمارتوں کو پیوند زمین کر کے اس تاریخی شہر کو بقول نظیر ایک ذرا سا گاؤں بنا دیا تھا۔ نظیر نے اسی شہر کے گرد و نواح میں اس طویل ڈرامے کا مشاہدہ کیا، جو سارے ہندوستان میں کھیلا جا رہا تھا۔ مسلسل جنگ و جدل، قتل عام، لوٹ مار، آبادیوں کی بربادی، قصبوں اور شہروں کی ویرانی، نسلوں کی تباہی، صنعت و حرفت کی بے قدری، معاشی بدحالی اور بے روزگاری کے اثر سے پیدا ہونے والی معاشرتی قباحتیں اور اخلاق سوزی کے ہمہ گیر واقعات۔ نظیر کی شاعری اسی ماحول میں پروان چڑھی، اور یہی سیاسی اور معاشی پس منظر ان کی مختلف النوع نظموں میں متشکل ہوا ہے۔

نظیر کا موضوع:

نظیر اکبر آبادی کوئی سیاسی مفکر، ماہر معاشیات یا معاشرتی مصلح نہیں تھے کہ اپنے ماحول کے عبرت انگیز حالات کو دیکھ کر وہ کوئی راہِ نجات یا راہِ عمل لوگوں کے سامنے پیش کرتے۔ نہ ہی اس زمانے میں ملکی یا قومی مفاد کے لیے کوئی ایسی اجتماعی تحریک موجود تھی، جو نظیر کے افکار و اشعار سے فائدہ اٹھاتی۔ یہ دور افراتفری، انتشار پسندی اور نفسا نفسی سے عبارت تھا۔ ملکی مفاد یا اجتماعی فلاح و بہبود پر ذاتی منفعت کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ہر فرد و بشر اپنے اپنے حال میں سرگرداں تھا۔ طوائف الملوکی نے ملک میں کوئی مرکزی نظام حکومت قائم نہ رہنے دیا تھا۔ نواب اور راجواڑے اپنی اپنی ریاستوں، جاگیروں اور ملکیتوں کے لیے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے اور اپنے اپنے تحفظ و بقاء کے لیے ایک غیر ملکی طاقت کے سامنے سر جھکا رہے تھے۔ ملک ایک بحرانی دور میں سے گزر رہا تھا۔ زندگی کی ہر قدر تہ و بالا ہو رہی تھی۔ پرانی قدریں قصہ پارینہ بن چکی تھیں۔ نئی اقدار حیات نے ابھی جنم نہ لیا تھا۔ ملک کی سیاسی و عمرانی زندگی تذبذب اور گومگو کی حالت میں تھی۔ فنا و بے ثباتی کا احساس اسی وجہ سے معاشرے کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا۔ نظیر کی اکثر نظموں میں زندگی اور زندہ دلی کا بے پایاں جذبہ پایا جاتا ہے۔ لیکن ایسی نظموں کی بھی کمی نہیں، جن میں موت، فنا اور بے ثباتی و ناپائیداری کا الم انگیز احساس ان جذبات حیات پر غالب آ جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ تضاد نظیر کی طویل زندگی کے مختلف ادوار کے رنگا رنگ احساسات کا نتیجہ ہو۔ لیکن یہ تضاد خود ہندوستانی معاشرے میں بھی موجود تھا، اور شاید ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ یہاں شادی اور غم پہلو بہ پہلو ملتے ہیں۔ نظیر کے عہد میں بھی ایک طرف سیاسی حالات کی ابتری تھی۔ امن و امان کے فقدان نے لوگوں کی زندگی کو تلخ تر بنا رکھا تھا اور دوسری طرف خوشی کا کوئی ایک لمحہ اور روشنی کی کوئی ایک کرن بھی اگر کہیں سے اس تاریک فضا

Scanned with CamScanner

میں میسر آجاتی تھی، تو ہندوستانی عوام اسے ضائع نہیں جانے دیتے تھے۔ خوشی و مسرت کے یہ ہمہ گیر مواقع ہندوستان کے مختلف موسمی، مذہبی تہوار تھے، جن کو عوام بڑے جوش و خروش سے مناتے تھے اور چند لمحوں کے لیے گرد و پیش کے سارے دُکھ اور غم اُن کو بھول جاتے تھے۔ نظیر نے بھی ان عمومی تہواروں کو، خواہ وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے، اسی رنگ میں لیا ہے اور معاشرتی زندگی کے اس نشاط انگیز پہلو کی عکاسی کرتے ہوئے بھی عوام کی بہت سی حالتوں کو بیان کیا ہے.....!

نظیر ہندوستانی معاشرے کے ایک ایسے رُکن تھے، جنھوں نے عام اجتماع انسانی میں گھل مل کر بھی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ نظیر کی شاعری اور ان کی زندگی دونوں کا کینوس خاصا وسیع ہے۔ نظیر نے ایک وسیع المشرب انسان کی طرح ہر قسم اور ہر خیال کے لوگوں میں بود و باش اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کی ہر سطح پر اُن کا مطالعہ بالکل ذاتی، نہایت تفصیلی اور حقیقت پر مبنی ہے اور اسی لیے ان کی نظموں میں بڑی ہمہ گیری ہے۔ اس ہمہ گیری میں ملکی زندگی کے بہت سے پہلو سمٹ آتے ہیں۔ لیکن نظیر کا موضوع سیاست کم ہے اور انسان اور اس کی معاشرت زیادہ.....!

نظیر کی منظومات:

نظیر نے اپنی جولانیٔ طبع کا ثبوت مختلف النوع نظموں میں دیا ہے۔ یہ نظمیں نظیر کے سیاسی ماحول اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان میں نظیر کے مشاہدے اور تجربے کا جو ہر موجود ہے جو انھوں نے زندگی کے رنگا رنگ ہنگاموں، اعلیٰ مجلسوں اور عوامی میلوں ٹھیلوں، ہندوستان کے مختلف مذہبوں، فرقوں اور طریقوں کے معتقدات، رسم و رواج اور ان کے باہمی میل جول کو دیکھ کر انسان اور اس کی معاشرت کے بارے میں حاصل کیا۔ نظیر نے ان نظموں میں صرف اپنے مشاہدات ہی کو پیش نہیں کیا بلکہ ان پر حتی المقدور تنقید و تبصرہ بھی کیا ہے اور معلمانہ انداز میں اپنے سامعین کو سمجھاتے ہوئے پند و موعظت سے بھی کام لیا ہے۔ گرد و پیش کے حالات و واقعات کے مشاہدے اور ان کے تجزیے سے نظیر کے ہاں ایک فلسفۂ حیات بھی پیدا ہوا ہے۔ ہر چند کہ اس فلسفہ حیات میں اثباتی نقطہ نظر سے زیادہ گہرائی نہیں اور نہ ہی یہ فلسفہ حیات اس عہد کے منفیانہ رجحانات سے یکسر مبرا ہے۔ تاہم اس میں زندگی کی صحت مند قدروں کا عنصر غالب ہے۔ اس فلسفہ حیات کو نظیر نے مختلف عنوانوں سے اپنی نظموں میں بیان کیا ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ فنی لحاظ سے نظیر نے اپنی نظموں میں مخمس اور مسدس کے پیمانوں کو ترجیح دی ہے۔ ان پیمانوں کو اختیار کرنے میں خوبی یہ ہے کہ عمومی زندگی کے مختلف واقعات کو مرقعوں کی شکل میں تسلسل کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ نظم کا ہر بند اپنے دامن میں زندگی کا ایک واقعہ، ایک مرقع یا ایک منظر لیے ہوئے ہے اور مخمس میں ٹیپ کا مصرع یا مسدس کی صورت میں ہر بند کا آخری شعر ان متعدد واقعات کو ایک سلک میں منسلک کرنے کے علاوہ ایک مجموعی تاثر بھی قائم رکھتا ہے۔ نظموں کا لب و لہجہ اور بحروں کا انتخاب اکثر موضوع

Scanned with CamScanner

ناہمواری کا نتیجہ تھے لیکن اس میں کسی طبقے کا محاسبہ یا دل آزاری نہیں کی گئی۔ یہ نظیر کا خاص مسلک تھا کہ کسی بات سے کسی انسان کا دل نہ دکھے، خواہ وہ کیسا ہی بدقماش کیوں نہ ہو..... یہی وجہ ہے کہ ان مرقعوں یا کارٹونوں کو دیکھنے والا محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نظیر نے ایک نکتہ شناس مبصر کی حیثیت سے دنیائے دُوں کا جو طرفہ تماشا دیکھا، اسے چند مرقعوں میں پیش کیا ہے۔ یہ مرقعے شاعر کے علاوہ تماشائیوں کے ہوش کھونے کے لیے کافی ہیں..... نظیر کی اس نظم کے چند بندوں کا مطالعہ یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا:

نہیں ہے زور جنھوں میں وہ کشتی لڑتے ہیں — جو زور والے ہیں وہ آپ سے بچھڑتے ہیں
جھپٹ کے اندھے بھی پیروں کے تئیں پکڑتے ہیں — نکالے چھاتیاں کبڑے اکڑتے پھرتے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

زباں ہے جس کی اشارت سے وہ پکارے ہے — جو گونگا ہے وہ کھڑا فارسی بگھارے ہے
کلاہ جس کی کوا کھڑا اُتارے ہے — اُچھل کے مینڈکی ہاتھی کے لات مارے ہے
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

چمن ہیں خشک بنوں بیچ آب جاری ہے — خراب پھول ہیں کانٹوں کی گلعذاری ہے
سیاہ گوش کو بلّی نے لات ماری ہے — دبکتے پھرتے ہیں چیتے ہرن شکاری ہے
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

جنھوں کی ڈاڑھی ہے ان کی تو بات واہی ہے — جو ڈاڑھی منڈے ہیں ان کی سند گواہی ہے
سیاہی روشنی اور روشنی سیاہی ہے — اُجاڑ شہر میں مُردوں کی بادشاہی ہے
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

جنھوں میں عقل نہیں وہ بڑے سیانے ہیں — جو عقل رکھتے ہیں وہ باولے دوانے ہیں
زنانے شوق سے مردوں کے پہنے باناے ہیں — جو مرد ہیں وہ بڑے بھجڑے زنانے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

عزیز تھے سو ہوئے چشم میں سبھوں کی حقیر — حقیر تھے سو ہوئے سب میں صاحب توقیر
عجب طرح کی ہوائیں ہیں اور عجب تاثیر — اچنبھے خلق کے کیا کیا بیاں کروں میں نظیر
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

اقتصادی احوال:

نظیر کی شاعری میں اقتصادیات ایک نہایت اہم موضوع ہے۔ "شہر آشوب" کے علاوہ دیگر موسمی اور

Scanned with CamScanner

تقریباً تمام نظموں میں بھی انھوں نے زندگی کی اس اہم حقیقت پر بہت زور دیا ہے۔ لیکن خالصتہً اس موضوع پر انھوں نے متعدد نظمیں لکھی ہیں، جن کے عنوان (مع مصرع اوّل) درج ذیل ہیں:

۱۔	کوڑی یا کوڑی کی فلاسفی:	کوڑی ہے جن کے پاس وہ اہلِ یقین ہیں
۲۔	پیسے کی عزت:	نقش یاں جس کے میاں ہاتھ لگا پیسے کا
۳۔	پیسا یا پیسے کی فلاسفی:	پیسے ہی کا امیر کے دل میں خیال ہے
۴۔	روپیہ یا روپے کی فلاسفی:	نقشا ہے میاں سو طرب و رقص کی رے کا
۵۔	زر یا زر کی فلاسفی:	دنیا میں کون ہے جو نہیں مبتلائے زر
۶۔	مفلسی یا مفلسی کی فلاسفی:	جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
۷۔	افلاس کا نقشہ:	رکھ بوجھ سر پہ نکلا اشتر ملا تو ایسا
۸۔	آٹے دال کا بھاؤ:	کیا کہوں نقشہ میں یارو خلق کے احوال کا
۹۔	آٹے دال کی فلاسفی:	آٹے کے واسطے ہے ہوس ملک و مال کی
۱۰۔	روٹی کی فلاسفی:	جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں
۱۱۔	چپاتی کی فلاسفی:	جب ملی روٹی ہمیں سب نورِ حق روشن ہوئے
۱۲۔	پیٹ کی فلاسفی:	کرتا ہے کوئی جور و جفا پیٹ کے لیے

ان عنوانوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے ہی سے یہ بات صاف نظر آ جائے گی کہ یہ نظیر کا دلپسند موضوع ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نظیر نے اقتصادیات کے موضوع کو اتنی زیادہ اہمیت آخر کیوں دی؟ اس کا ایک جواب تو یہی ہے کہ نظیر کے عہد میں سیاسی حالات کی ابتری کے باعث معاشی بدحالی اور بے روزگاری اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا انھوں نے ایک باشعور فن کار کی حیثیت سے اپنے ہم عصر اردو شعرا کی طرح عمومی زندگی کے اس اہم رُخ کو جو درد و الم سے لبریز تھا، اپنے فن کا موضوع بنایا۔ یہ موضوع غالباً اس لیے بھی انھیں زیادہ مرغوب ہوگا کہ وہ خود یا اُن کے بعض ہم پیشہ لوگ (معلّم) نیم فاقہ کشی کی حالت میں گزر اوقات کر رہے تھے۔ ایک نظم کے ایک بند میں نظیر نے اس امر کی طرف اشارہ بھی کیا ہے:

جو اہلِ فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں — مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اُسے بے بتاتے ہیں — وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
اُن کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

(مفلسی)

اقتصادیات سے دلچسپی کی ایک اور وجہ نظیر کا مطالعہ تاریخ بھی ہے۔ بقول مخمور اکبر آبادی "نظیر کو تاریخ سے بہت زیادہ دلچسپی تھی" (۷)۔ یہ بات کچھ اس وجہ سے بھی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ایک ذی علم

Scanned with CamScanner